حجاج بن یوسف بن مطر نے کیا تھا مگر پیشِ نظر اُردو ترجمہ میں یہ نام "حجازی بن یوسف" ہے۔

اور بعض جگہ اُردو ترجم سے تسامح ہوا ہوگا، بالخصوص مصطلحاتِ فنیّہ کے ترجمہ میں، اور اس کی وجہ ظاہر ہے، اس مقالہ کا موضوع کچھ اس قسم کا ہے جو آج سے چالیس پچاس سال پیشتر تک اُردو مترجمین بلکہ اکثر فضلاء کے لئے بھی بالکل ایک نئی چیز تھا۔

کتاب سات مقالوں پر مشتمل ہے، پہلے پانچ مقالے سیاسی تاریخ پر ہیں، ان کا ترجمہ مولوی عبدالغفور خاں رام پوری نے کیا تھا، آخری مقالہ اسلام کی موجودہ حالت پر ہے، چھٹا مقالہ اسلامی ثقافت (علوم وفنون) پر ہے، ان دونوں آخری مقالوں کا ترجمہ مولوی عبدالحلیم انصاری نے مولانا ظفر الملک علوی کے ایماء سے کیا تھا، بعد ازاں پوری کتاب کے ترجمہ پر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور نے نظر ثانی کی، پھر بھی بہت سے تسامحات رہ گئے، بالخصوص مقالۂ ششم کے باب اول کے ترجمہ میں جو ریاضی وہیئت اور جغرافیہ پر مشتمل ہے۔

پوری کتاب پر تبصرہ فرصت کا مقتضی ہے جو بجائے خود عنقا ہے، اس لئے "مالا یُدرَک کلہ لا یترک کلہ" کے مصداق مقالۂ ششم کے باب اول کے پہلے سولہ[16] مباحث پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے، تبصرہ تعلیقات کی شکل میں پیش کیا جائے گا، اس غرض سے پہلے پورا مبحث نقل کیا جائیگا، ازاں بعد محل نظر تسامحات کی نشاندہی کرکے مختصر طور سے اُن کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی، وباللہ التوفیق۔

مقالۂ ششم

عہدِ اوّل کا عربی تمدّن

مدرسۂ اسکندریہ کے بعد مدرسۂ بغداد کی علمی مرکزیت

ابتدائے عہدِ اسلام میں اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام قوت فتحِ ممالک اور اشاعتِ اسلام میں صرف کی، صحابۂ کرام کے بعد جو نسل ہوئی اُس نے کچھ کچھ علومِ ادبیہ کی جانب توجہ کی، لیکن اس نسل کی بھی بہت کچھ قوت فتحِ ممالک اور نشرِ اسلام ہی پر صرف ہوئی تا آنکہ مسلمانوں میں اندرونی فتنہ وفساد کی آگ بھڑکی اور وہ خانہ جنگیوں میں مصروف ہوکر کشور کشائی اور علمی مشاغل دونوں سے الگ ہوگئے۔

یہ خانہ جنگی ختم ہوئی اور اسلامی حکومت کو یکسوئی حاصل ہوگئی تو فتوحات کا سیلاب پھر اُمنڈا اور اس مرتبہ اسلامی فتوحات کے سیلاب کی لہریں دنیا کے بہت دور دراز ممالک تک پہونچ گئیں، مسلمانوں کو عظیم الشان اور نمایاں فتحیں حاصل ہوئیں خصوصاً سنہ ۱۵۰ھ میں دولتِ بنی اُمیہ کے زوال کے بعد وہ مشرق میں ممالکِ شام و فارس کی جانب دریائے سندھ اور دریائے قزوین تک اور مغرب میں تمام شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے اندلس کے بہت بڑے حصہ کو اپنے زیر نگیں کر چکے تھے اور ملک فرانس پر حملہ آور ہو کر اُسے پامال اور مسخر کر لینے کی دھمکی دے رہے تھے، مگر فرانس کے حکمراں چارلس مارٹل نے اقلیم نوارہ کے میدانی علاقہ میں خلیفہ عبد الرحمٰن الاموی تاجدار اندلس کے لشکر کو شکستِ فاش دی اور کچھ اس طرح غارت کر ڈالا کہ بارِ دیگر مسلمانوں کو فرانس پر فوج کشی کی جرأت نہ ہو سکی۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مزید کشور کشائی سے استغنا پیدا ہو گیا، اور تیغ و سناں کی بازی سے متبرّا ہو کر انہیں قلم و کاغذ کا کھیل مرغوب ہو چلا، حامی علم و فن اور علماء پرور خلفاء کی پیروی میں عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علمی منافست و مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہالت فنا ہو گئی اور اُمم مشرقیہ بلکہ تمام اسلامی ممالک میں عربی مصنّفات و مؤلفات بکثرت شائع ہو گئیں، انھیں مصنفات کے بڑے حصّے سے جو آج تک موجود ہے، عربی لٹریچر مرکب ہے اور یہ ذخیرۂ علم و ادب یقیناً دنیا کے مشہور و وسیع ترین علوم و ادبیات میں داخل ہے۔

محلاتِ نظریہ

اس تمہیدی مقدمہ میں تین باتیں مزید توضیح و اصلاح کی مستحق ہیں:-

۱- مدرسۂ اسکندریہ کے بعد مدرسۂ بغداد کی علمی مرکزیت۔

۲- ابتدائے عہدِ اسلام میں اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام قوت فتحِ ممالک اور اشاعت اسلام میں صرف کی،

۳- صحابۂ کرام کے بعد جو نسل ہوئی، اس نے کچھ کچھ علوم ادبیہ کی جانب توجہ کی۔

تبصرہ

(۱) مستشرقین کا خیال ہے کہ مدرسۂ بغداد اسکندریہ کے میوزیم اور اکیڈیمی کے انداز پر قائم ہوا تھا، یہ خیال غلط ہے، مدرسۂ بغداد جندی سابور ایران کی یادگار کے طور پر ظہور میں آیا تھا، بغداد عباسی عہد میں تعمیر ہوا جو

ایرانیوں کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے تھے، لہٰذا انھوں نے ہر معاملے میں بالخصوص علم وادب کی سرپرستی میں ایرانی روایات ہی کا احیاء کیا، خاص طور پر مامون الرشید (۱۹۸ - ۲۱۸ ھ) کی تخت نشینی تو گویا خسرو انوشیرواں کا تختِ کیانی پر بازِ جلوس تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

ممکن ہے عباسیوں کی پیشرو یعنی اموی حکمران رومن روایات سے متاثر ہوئے ہوں، مگر تاریخ شاہد ہے کہ اُن کے زمانہ میں علم وادب کی کوئی خاص سرپرستی نہیں ہوئی۔

(۲) موسیو سدیو کے اس خیال سے کہ ابتدائے عہدِ اسلام میں صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام توجہ فتوحات اور اشاعتِ اسلام پر مرکوز کردی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اصولی طور پر اسلام کو کشور کشائی وملک گیری کی ایک تحریک سمجھ لیا ہے، یہ خیال بھی غلط ہے،

واقعہ یہ ہے کہ اسلام صرف ایک دینی تحریک تھی جس کا مقصد بندوں کو اپنے رب کی "عبارت" کی طرف رہنمائی کرنا تھا، کیوں کہ اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے یہی مقصدِ تخلیق ہے۔[۱] اور اسی مقصد کے تحقق کے لئے بدء آفرینش سے نبی آخرالزماں کے زمانہ تک انبیاء ورسل مبعوث ہوتے رہے تھے۔[۲]

اس اصولی تعلیم کا منطقی نتیجہ انسانیت کی عظمت اور انسانوں کی مساوات تھا، مگر خود غرض افراد نے اقتصادی دستبرد اور اپنے ابناءِ جنس کی گاڑھے پسینے کی کمائی نیت منیت ہیں کھانے کے لئے اس بنیادی حقیقت کو انسانی ذہن سے فراموش کرنے کے لئے نت نئی آئیڈیالوجیاں تراش لی تھیں، لہٰذا جب اسلام مبعوث ہوا تو اربابِ اقتدار اور بندگانِ ہوس کو اس بنیادی تعلیم میں اپنی موت صاف نظر آئی، اس لئے پہلے خود عرب اقتدار پرستوں نے اور پھر عرب کے ہمسایہ جابرۂ روزگار نے بزورِ شمشیر اس انقلابی تحریک کو دبانے کی کوشش کی، اسلام جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، امن وآشتی کا پیغام تھا، مگر انجام کار اسی امن وآشتی کے تحفظ کے لئے اُسے بفحوائے آیۂ کریمہ "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ" شمشیر بکف ہونا پڑا۔

---

[۱] سورۂ ذاریات - ۵۶ - "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ"۔

[۲] سورۂ انبیاء - ۲۵ - "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ"۔

یہ حقیقت تھی اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "فتح ممالک" پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی، اور اگر اُن کی جانب سے بدر یا یرموک یا قادسیہ کہیں بھی تہذیب دشمنی کا اظہار ہوتا تو خدا ہی جانتے تاریخِ عالم کے دھارے کا کیا رُخ ہوتا۔

(۳) موسیو سدیو نے لکھا ہے:

"صحابۂ کرام کے بعد جو نسل ہوئی اُس نے کچھ کچھ علومِ ادبیہ کی جانب توجہ کی"

اس باب میں چند چیزیں قابلِ غور ہیں:-

(ا) جس سرعت کے ساتھ اسلام نے علمی و ثقافتی ترقی کی، اس کی نظیر تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملے گی، اسلام ایسے ملک میں مبعوث ہوا جو "جہالت" کا مصداق تھا اور جسے علم پر نہیں بلکہ "جہل" پر فخر تھا، ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:-

اَلَا لَا یَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا ؛ فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِیْنَا

(ب) بعثتِ اسلام کے وقت پورے ملکِ عرب میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، مگر یہ اسلام کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ اُس نے نیم متمدن وحشی اور اَن پڑھ بدّوؤں کو قلیل مدت میں اتنا صاحبِ علم و فضل بنا دیا کہ وہ آج کی متمدن دنیا کے استاد قرار پائے، لیکن تاریخ کے اس اعجوبہ میں خارجی اسباب کا کوئی دخل نہیں ہے، یہ اسلام کی داخلی تعلیم کا منطقی نتیجہ تھا، چنانچہ نزولِ قرآن کا آغاز ہی "اقرءْ" کے ایجابی امر سے ہوا:-

"اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ"

اس کے ساتھ اسلام نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں "لکھنے" سے کام لیں:-

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ بِالْعَدْلِ"

نتیجہ یہ ہوا کہ نوشت و خواند مسلمانوں کا ایک دینی فریضہ بن گئی جس میں مرد و عورت، شریف و وضیع اور امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تحریر و کتابت کے ساتھ جو اہتمام فرماتے تھے اُس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگِ بدر میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے اور ان میں جو لوگ زرِ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے، آپ نے حکم دیا کہ

ہر ایسا نادار قیدی مدینہ منورہ کے دس بچّوں کو نوشت وخواند سکھا دے، یہی اس کا زرِ فدیہ ہے۔

(ج) پھر اسلام نے "علم" کے ساتھ جو غیر معمولی اہتمام و اعتنا برتا، اُس کی مثال دنیا کا کوئی سماج پیش نہیں کر سکتا، اس نے مادّی نعمتوں کے بجائے علم و حکمت کو زندگی کی "قدرِ اعلیٰ" (خیرِ کثیر) قرار دیا۔

"وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا"

لہٰذا اس نے نزولِ قرآن کے افتتاح کے دن ہی انسان پر معبودِ برحق کی سب سے بڑی نعمت یہ بتائی کہ اُس نے اِس نادان کو دانائی سکھائی:۔

"اِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"

خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف قرآن ایک "معلمِ کتاب وحکمت" کی حیثیت سے کراتا ہے جس کی بعثت مومنین پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"

اور اس معلمِ کتاب وحکمت" نے اپنے جاں نثاروں کو ایجابی طور پر مامور کیا کہ خود کو اُس زیورِ شایستگی سے متعلق کریں جس کا نام علم ہے:۔

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ"

اس ترغیب وتشویق کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے پیروؤں میں حصولِ علم کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ قوم جس کا امتیازی وصف اسلام لانے سے پہلے "جہالت" تھا، مشرف باسلام ہونے کے بعد کچھ ہی دن میں مشرق ومغرب کے علمی خزانوں کی وارث ہو گئی کیونکہ اُن کے رسول نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ علم وحکمت مردِ مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے، جہاں ملے لے لے:۔

"کلمۃ الحکمۃ ضالّۃ المؤمن اینما وجدھا فھو احقّ بھا"

اور اس کی تلاش وجستجو کے لئے انہیں ایجابی طور پر مامور کیا تھا۔

"اطلبوا العلم ولو کان بالصین"

لہٰذا اپنے رسول کے اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے بحر و بر ناپ ڈالے، علم و حکمت کے موتیوں کی تلاش میں بستیاں اور ویرانے چھان ڈالے اور اپنی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل سے آخرکار آج کی متمدن دنیا کے اُستاد قرار پائے۔

(د) مسلمانوں نے صرف نوشت و خواند یا دینی علوم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سائنسی علوم میں بھی کمال حاصل کیا اور یہ "حصولِ کمال" اُن کے دین کی بنیادی تعلیم کا مقتضا تھا جسے جلد یا بدیر اُنھیں کرنا ہی تھا، اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید در بوبیت" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، بالفاظِ دیگر اللہ رب العزت کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں سب اُس کے محکوم ہیں، کائنات کی وہی سب سے افضل و اشرف مخلوق ہے، دنیا کی ہر چیز اُس کے واسطے پیدا کی گئی ہے اور وہ صرف خلاقِ کائنات کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس تعلیم کا منطقی نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ پیروانِ اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور اُس کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں، اسی کا نام تسخیرِ کائنات ہے جس کے لئے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے اور اسی تسخیر ارض و سمٰوٰت اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت کا نام "علمِ طبیعی" اور نیچرل سائنس ہے،

اس لئے قرآن اپنے متبعین کو مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہرِ کائنات کا مشاہدہ کریں اور جو لوگ اس فریضہ سے پہلو تہی کرتے ہیں وہ ان پر زجر و توبیخ کرتا ہے،

"اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ"

غرض تاریخ کا یہ ناقابلِ تردید واقعہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اُن تمام علوم کی ہمت افزائی کی جو آج یا آئندہ طبیعیاتی علوم کے تحت میں محسوب کئے جائیں گے، چنانچہ جب آیۂ کریمہ:۔

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ"

کا نزول ہوا تو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وَیْلٌ لِّمَنْ لاکھا بین لحییہ ولم یتفکر فیھا"

اور یہ رجحان علمائے دین میں آخر تک برقرار رہا ہے چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"من لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ۔" جو شخص علمِ ہیئت اور علم تشریح الاجسام نہیں جانتا وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مردِ میدان نہیں ہے۔

ان دینی تعلیمات کا جو متبعینِ اسلام کے اعماقِ قلب میں راسخ ہو چکی تھیں، یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ جلد از جلد جملہ علوم میں کمال حاصل کرلیں، گزشتہ فاتحین مفتوحہ ممالک کے علمی ذخائر کو نیست و نابود کردیا کرتے تھے مگر مسلمانوں نے انھیں حرزِ جان بنایا، اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور پھر اپنے شوقِ بے پایاں سے اُس میں چار چاند لگائے۔

(۵) اسلام نے جس تیزی سے علمی و ثقافتی ترقی کی اُس کی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی، آج قرنِ اوّل کے مسلمانوں کے علمی شوق کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا،

۶۲۲ء میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ پہونچتے ہیں اور اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالتے ہیں، اس کے بعد کے گیارہ سال خارجی قوتوں سے جو اسلام کو مٹانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا چکی تھیں، نبرد آزمائی میں گزرتے ہیں، عرب اقتدار پرستوں سے فرصت ملتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ رومن تجبّر اسلام کی بیخ کنی کے لئے یرموک میں فوجیں جمع کر رہا ہے، اسی عرصہ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے جا ملتے ہیں۔

۶۳۳ء (مطابق ۱۱ھ) میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُن کے جانشین ہوتے ہیں، جنھیں باہر کے رومی حملے کے علاوہ داخلی طور پر منکرینِ زکوٰۃ کے فتنہ کا سامنا کرنا ہے، اس سے زیادہ خطرناک مدعیانِ نبوت کی دسیسہ کاریوں کا تدارک کرنا ہے جنھیں پوشیدہ طور پر ایران کے اربابِ اغراض کی شہ مل رہی تھی، صدیقِ اکبرؓ ان مسائل سے بڑی تیزی سے نبٹنا چاہتے ہیں کہ خود انتقال فرما جاتے ہیں اور اُن کے جانشین عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے پیشرو کی پالیسی برقرار رکھتے ہیں، نیز حدودِ اسلام کے تحفّظ کی خاطر فارورڈ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دس سال بعد وہ بھی شہید ہو جاتے ہیں، ان کے جانشین عثمان ذی النورین رضؓ ہوتے ہیں، اُنہیں اپنے پیشرو کی فارورڈ پالیسی جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس اندرونی فتنے سے سابقہ پڑتا ہے جو بزورِ شمشیر اسلام کو مٹانے سے مایوس ہو کر اندرونی طور پر اُس میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش میں سرگرم تھا، اس کے سدِ باب کی کوشش میں بارہ سال بعد وہ بھی شہید ہوتے ہیں اور علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اُن کے جانشین ہوتے ہیں، لیکن جو فتنہ اُٹھ چکا تھا وہ آسانی سے فرو ہونے والا نہ تھا: پہلے جنگِ جمل ہوئی، پھر جنگِ صفین، پھر تحکیم کا مسئلہ آیا جس کے

نتیجہ میں خوارج کا فرقہ ظہور میں آیا اور اُن کی اصلاح کے لئے نہاوند کی لڑائی ہوئی، مگر سب بے سود اور انجام کار پانچ سال بعد (سنہ ۴۰ھ) خلافتِ اسلام کا سربراہ ایک خارجی کی تلوار سے شہید ہو جاتا ہے۔

یہ چالیس سال کی مدت ہے جو قوموں کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، وحشی اقوام کو بربریت سے نکلنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں، عرب کے نیم متمدّن بدو چالیس سال میں کیا کر سکتے تھے، مگر اسلام کا کرشمہ ہے اور اس کی دینی تعلیم کا نتیجہ کہ اس قلیل مدت میں جس کا بیشتر حصّہ بیرونی قوموں سے نبرد آزمائی اور داخلی فتنوں کی سرکوبی میں گزرا، ایسے لوگوں نے جو تحریر و کتابت سے بھی ناآشنا تھے، حصولِ علم کی جانب غیر معمولی سرعت سے قدم اُٹھائے:-

عرب بعثتِ اسلام سے پیشتر کتاب سے ناواقف تھے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی کہ اس ملک میں سب سے پہلی کتاب جو مدوّن ہو وہ "اللہ کی کتاب" (قرآنِ کریم) ہو، چنانچہ عہدِ صدیقی میں حضرتِ عمرؓ کے اصرار سے زید بن ثابتؓ کے اہتمام میں قرآنِ حکیم جمع ہوا۔

اس کے بعد شمعِ رسالت کے پروانوں نے اپنے ہادی و رہنما کے اقوال و اعمال کو جمع کیا، حدیثِ رسولؐ کے ان قدیم مجموعوں میں حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ، اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجموعے زیادہ مشہور ہیں، اس طرح علم حدیث کی بنیاد پڑی،

نوشت و خواند سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ عرب علم الحساب سے بھی زیادہ واقف نہ تھے، حتیٰ کہ اُنکی لغت میں ہزار "اَلْفٌ" سے زیادہ کا کوئی عدد نہ تھا، مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مالِ غنیمت کے اندر بے شمار دولت آنے لگی تو اُس کے لئے بیت المال قائم کیا گیا۔ بیت المال میں روپیہ رکھنے اور تقسیم کرنیکے لئے حساب دانی کی ضرورت تھی، پھر تجارتی لین دین بھی بڑھ گیا تھا، نیز لوگ ترکے میں بڑی بڑی رقوم اور نزدیک و دور کے مختلف الانواع ورثاء چھوڑنے لگے، جس کی وجہ سے "مناسخہ" کے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے، ان کے حل کے سلسلے میں "علم الحساب" کو خاصی ترقی ہوئی۔

بعثتِ اسلام سے پیشتر عربوں کی اقتصادیات "گلّہ بانی کی معیشت" پر قائم تھی، عہدِ فاروقی میں "زرعی معیشت" کو بھی اہمیت حاصل ہو گئی، سنہ ۱۷ھ میں سوادِ عراق کا علاقہ فتح ہوا، جسے آپ نے مفتوحین ہی کے قبضے میں خراج پر چھوڑ دیا

تشخیصِ خراج کے لئے اُس کی پیمائش کی گئی، یہ کام حضرت عثمان بن حنیف رضؓ نے انجام دیا، اس طرح مساحت اور ہندسہ کی ابتدا ہوئی۔

عہدِ عثمانی میں جب مختلف ممالک کے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو اُن کے مختلف لہجوں کی وجہ سے قرآن کی قرأت میں اختلاف پیدا ہونیکا اندیشہ ہونے لگا، اسلئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحفِ صدیقی کی نقلیں کراکر مختلف ممالک میں بھیج دیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اسلام کی تاریخ میں علم وحکمت کے مظہر اور "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" کے مصداق سمجھے جاتے ہیں، اکثر مسائلِ علمیہ کا حل آپ کی خداداد ذہانت سے منسوب ہے، مگر سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ نحو کی ایجاد ہے، آپ ہی کے ایماء سے ابوالاسود دؤلی نے اس فن کو مدوّن کیا، تاریخ شاہد ہے کہ کسی اور قوم نے اتنی جلدی اپنی زبان کی گرامر مدون نہیں کی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوگئے، مگر چھ مہینہ بعد امیر معاویہ رضؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے، امیر معاویہ (۴۰ھ، ۶۰ھ) عرب کے دہاۃ اربعہ میں محسوب کئے جاتے ہیں، اسی سیاسی تدبر کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے وہ خود کو سلاطینِ عہدِ ماضی کی سیرت وسیاست سے باخبر رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس غرض سے انھوں نے یمن سے عبید بن شریہ کو بلاکر تاریخِ قدیم پر کتابیں لکھوائیں جن میں سے دو مشہور ہیں کتاب الامثال اور کتاب الملوک واخبار الماضیین، اس طرح اسلام میں تاریخ کے فن کا آغاز ہوا، اُس زمانہ کے دوسرے مشہور ماہرینِ اخبار وانساب وغفل بن حنظلا السدوسی، صحار العبدی، ابن الکواء وغیرہ ہیں۔

ان لوگوں کے اتباع میں تاریخ کے فن کو ترقی ہوئی اور کچھ ہی عرصہ میں اشخاص کے علاوہ افکار وآراء بھی تاریخی تدوین کا موضوع بن گئے چنانچہ ابن الندیم نے واصل بن عطاء الغزال (المتوفی ۱۳۱ھ) کی تصانیف میں اس قسم کی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے جیسے طبقات اہل العلم والجہل، کتاب اصناف المرجئہ وغیرہ۔

بعض مصالح کی بنا پر مشروع کے اموی حکمرانوں نے دیوان خراج کو غیر ملکی زبانوں میں رکھا:- مغربی علاقے کا دیوان خراج رومی زبان میں تھا اور مشرقی ممالک کا فارسی میں، لیکن عبدالملک بن مروان (۶۶-۸۶ھ) کے عہد میں دونوں جگہ دیوان عربی زبان میں منتقل ہوئے یعنی مسلمانوں کی سعی واعتناء سے عربی زبان اتنی جلد اس قابل ہوگئی

کہ خراج کے پیچیدہ حسابات بھی اس میں رکھے جاسکیں۔

عبدالملک ہی کے عہد میں خالد بن یزید بن معاویہ کو حصولِ خلافت سے مایوس ہونے کے بعد کیمیا کا شوق دامن گیر ہوا اور اُس نے یونانی و قبطی زبانوں سے کیمیا، نجوم اور طب کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں، ابن الندیم لکھتا ہے:

"الذی عنی باخراج کتب القدماء فی الصنعۃ خالد بن یزید بن معاویہ ..... وھو اول من ترجم لہ کتب الطب والنجوم وکتب الکیمیاء"

جس شخص نے فن کیمیا کے اندر متقدمین کی کتابوں کو شائع کرنے کے ساتھ توجہ کی وہ خالد بن یزید بن معاویہ ہے ..... وہ پہلا شخص ہے جس کے واسطے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ غیر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کا کام شروع ہوا، کچھ دن بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ (۹۹ - ۱۰۱ ھ) نے ماسرجویہ طبیب سے اہرن القس کی طبی کناش کو عربی میں ترجمہ کرایا۔

ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ - ۱۲۵ ھ) کے کاتب سالم ابوالعلاء نے ارسطو کے اُن رسائل کا عربی میں ترجمہ کیا جو اُس نے سکندر کو لکھے تھے،

اسی زمانہ میں نجوم کے ساتھ مسلمانوں کا اعتنا بڑھنے لگا، اسلام نے ہیئت کی تو ہمت افزائی کی تھی مگر نجوم (جوتش) کی ممانعت کی تھی، لیکن نجوم کا ذکر عبدالملک اور حجاج کے زمانہ میں سننے میں آتا ہے، غالباً یہ اندر ہی اندر مقبولیت حاصل کرتا رہا تھا، چنانچہ ولید بن یزید (۱۲۵ - ۱۲۶ ھ) اس کا شائق تھا، اور اُس نے دو منجموں سے اپنا زائچہ بنوایا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولید ثانی کے زمانہ تک نجوم عربی ادب میں اچھی طرح متعارف ہو چکا تھا اور اس فن پر عربی میں کافی کتابیں لکھی جانے لگی تھیں، چنانچہ نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ جس کا سن کتابت ۱۲۵ھ ہے حسبِ تصریح نلینو میلان کی لائبریری میں موجود ہے۔

یہ ایک اجمالی خاکہ ہے عرب کے نیم متمدن بدوؤں کی علمی کوشش کا جنھوں نے اسلام کی برکت سے اتنے قلیل عرصہ میں اتنی ترقی کرلی کہ تاریخِ عالم اُس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی یہ بالکل جدید کتاب ہے جو خاص طور پر غیر مسلم یورپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کیلئے لکھی گئی ہے، جدید ایڈیشن۔

قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:- مکتبۂ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات

(۶)

سعید احمد اکبر آبادی

سلسلے کیلئے دیکھئے برہان مارچ ۱۹۶۳ء

انسٹیٹوٹ میں اساتذہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن کا ادارہ سے مستقل تعلق ہے، اور دوسرے وہ جو کسی معین مدت کے لئے کسی خاص مضمون پر لکچر دینے کے لئے بلائے جاتے ہیں، ان حضرات کی مدتِ قیام و تعلق مختلف ہوتی ہے، کوئی برس دو برس یا پانچ برس کے لئے اور کوئی چھ مہینہ یا تین مہینہ یعنی دو ٹرم یا ایک ٹرم کے لئے میرے زمانۂ قیام میں ایک ٹرم کے لئے یہ دو صاحب آئے تھے، ایک ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی اور دوسرے ڈاکٹر ٹی ازٹسو (DR. T. IZUTSU)

ڈاکٹر الحسینی ڈاکٹر الحسینی اصلاً فلسطینی اور مشہور مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کے بھانجہ یا بھتیجہ ہیں، اسرائیلی حکومت کے قیام کے باعث فلسطین میں انقلاب پیدا ہوا اور اتحادِ عرب تحریک کے علمبرداروں کی دار و گیر شروع ہوئی تو یہ راتوں رات وطن کو خیر آباد کہہ قاہرہ میں آبسے اور اب آج کل وہاں امریکن یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں اور معہد الدراساتِ الاسلامیہ (INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES) سے بھی تعلق رکھتے ہیں، مختلف علمی اور دینی و لغوی انجمنوں اور اداروں کے سرگرم ممبر ہیں۔ قاہرہ کی اسلامی کانگریس کی روئداد (مطبوعہ برہان اپریل ۱۹۶۴ء) اٹھا کر ملاحظہ فرمائیے، اُس کی ایک نشست میں "نظام الحسبۃ فی الاسلام" کے عنوان سے ایک بلند پایہ مقالہ انھوں نے ہی پڑھا تھا۔ عربی زبان، ادب، اجتماع و سیاست غرض کہ مختلف

مباحث و موضوعات پر ان کی کتابیں ہیں، لندن یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ہے، عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی اور ترکی زبانیں بھی خوب جانتے ہیں، قدیم سامی زبانوں سے بھی واقفیت ہے، نماز پڑھتے ہیں اور رمضان آیا تو روزے بھی رکھے، عرب قومیت کی تحریک کے حامیوں میں سے ہیں اور اس موضوع پر انھوں نے بہت کچھ لکھا بھی ہے، مجھ کو ان کی یہ تحریریں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن متعدد بار میں نے اُن سے اس موضوع پر گفتگو کی تو میں نے طٰہٰ حسین، ریحانی اور بعض دوسرے لوگوں کی طرح زیادہ غالی نہیں پایا۔ وہ عام اسلامی اخوت کی اہمیت و برتری کے قائل اور معترف ہیں، ایک بار میں نے کھل کر گفتگو کی کہ زبان ایک سہی لیکن عرب کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی تاریخ اور کلچر ایک کہاں ہیں؟ تاریخ کے جو حصے مسلمان عربوں کے لئے قابلِ فخر ہیں وہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے سرمایۂ ننگ و عار ہیں، اسی طرح اسلامی کلچر میں جو چیزیں منکرات و فواحش میں داخل ہیں اُن میں سے بعض عیسائیوں اور یہودیوں کے کلچر میں ناجائز نہیں، پس اگر متحدہ قومیت کی بنیاد یہی چیزیں ہیں تو یہ بنیاد بڑی کھوکھلی اور ناپائدار ہے، عرب عرب ملکی اور وطنی معاملات میں سب ایک ہیں، اور مذہب یا نسل کی بنا پر اُن میں کوئی امتیاز نہیں، اگر عرب قومیت کا مقصد اور منشا یہی ہے تو۔ میں نے کہا — اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ملک کے استحکام کے لئے بہت ضروری ہے لیکن اگر عرب قومیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مشرق اور مغرب میں خطِ امتیاز کھینچ کر مغرب کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات ابھارے جائیں اور پھر خود مشرق میں عربوں کو بلا اختلافِ مذہب و ملت دنیا کی سب سے بہتر قوم قرار دیا جائے، جس نے یہودیت، عیسائیت اور اسلام ان تینوں مذاہب کی خاطر خواہ حفاظت کی اور اُن کو ترقی دی اور اس کے برخلاف خواہ مغربی گرجا ہو یا غیر عرب مسلمان اُن سب نے علی الترتیب عیسائیت اور اسلام کو مسخ کیا ہے، تو یہ بات اسلام کی تعلیمات اور اُس کی روح کے بھی خلاف ہے، تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی عربوں کے لئے مفید نہیں بیحد مضر اور ہلاکت انگیز ہے، ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی نے میری اس تقریر کو بڑی خاموشی اور صبر و سکون سے سنا اور بولے "یہ عرب قومیت کا مسئلہ ہے واقعی بڑا نازک ہے! اسی وجہ سے اب حکومتِ مصر نے اس موضوع پر لکھنے لکھانے اور بحث و گفتگو کرنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے، اس کے علاوہ عالمگیر اخوتِ اسلامی کا پرچار بھی وہاں جس زور شور سے ہو رہا ہے وہ کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے"